# فصل چہارم

# آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

(۲)

**امکانِ آخرت کے دلائل** منکرینِ آخرت اپنے انکار کے حق میں جو کچھ کہتے تھے اس کو نقل کر کے قرآن مجید میں جگہ جگہ وہ دلائل دیے گئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آخرت کا آنا قطعی طور پر ممکن ہے، اور اسے ممکن سمجھنا نہیں بلکہ غیر ممکن سمجھنا خلافِ عقل ہے۔

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ | کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اُسے ایک بوند |
| مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ۔ | سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا ؟ |
| وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ | اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو |
| قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ | بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا |
| رَمِیْمٌ - قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ | جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں" ؟ اس سے کہو، اِنہیں وہی |
| اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ | زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا، اور وہ |
| خَلْقٍ عَلِیْمٌ (یٰسٓ ۔ ۷۷ تا ۷۹) | تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ |

یعنی وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اُس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اُس جرثومے کو پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔ وہ ہمیں بھی عام مخلوقات کی طرح عاجز سمجھ رہا ہے اور اِس خیالِ خام میں مبتلا ہے کہ جس طرح انسان مردے کو زندہ نہیں کر سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اِسی لیے پوچھتا ہے کہ "ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟" ابن عباسؓ، قتادہؒ اور سعیدؒ بن جُبیر کی روایت ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آ گیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے

توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اُڑا کر آپ سے کہا، "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تم کہتے ہو کہ مُردے زندہ کر کے پھر اُٹھائے جائیں گے۔ اب بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا"؟ اس کا مختصر ترین اور بلیغ ترین جواب یہ دیا گیا کہ وہی جس نے اِسے پہلے پیدا کیا تھا۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا
ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝
قُلْ كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا ۝
اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ
فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُّعِيدُنَا ۚ
قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ
فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ
وَيَقُولُونَ مَتٰى هُوَ ۚ قُلْ
عَسٰٓى اَنْ يَّكُونَ قَرِيبًا ۝
يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ
بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّونَ اِنْ لَّبِثْتُمْ
اِلَّا قَلِيلًا ۝
(بنی اسرائیل ۴۹ تا ۵۲)

وہ کہتے ہیں "جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے؟" — ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو (پھر بھی تم اُٹھ کر رہو گے)" وہ ضرور پوچھیں گے "کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟" جواب میں کہو "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا" وہ (مذاق اُڑانے کے انداز میں) سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے "اچھا، تو یہ ہوگا کب؟" تم کہو "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اُس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔"

یعنی دنیا میں مرنے کے وقت سے لے کر قیامت میں اُٹھنے کے وقت تک کی مدت تم کو چند گھنٹوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔ تم اُس وقت یہ سمجھو گے کہ ہم ذرا دیر سوئے پڑے تھے کہ یکایک اس شورِ محشر نے ہمیں جگا اُٹھایا۔

وَيَقُولُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا
مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ
حَيًّا ۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ
اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ
يَكُ شَيْئًا (مریم ۶۶ تا ۶۷)

انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں رہا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى
رَيْبٍ مِّنَ ٱلْبَعْثِ فَإِنَّا
خَلَقْنَٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن
نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن
مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ
لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِى ٱلْأَرْحَامِ
مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ
نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا۟
أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَ
مِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ
ٱلْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ
عِلْمٍ شَيْـًٔا ۚ وَتَرَى ٱلْأَرْضَ
هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا
ٱلْمَآءَ ٱهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَ
أَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ۔

(الحج : ۵)

لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں
کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے
پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے،
پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور
بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت
واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ
خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک
بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش
کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم
میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی
بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے
کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین
سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا،
یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس
نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا:

وَبَدَأَ خَلْقَ ٱلْإِنسَٰنِ مِن طِينٍ
ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُۥ مِن سُلَٰلَةٍ مِّن
مَّآءٍ مَّهِينٍ ۔ (آیات ۷-۸)

انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل
ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ بہرحال ثابت ہے کہ زندہ انسان کی تخلیق بے جان مادّوں کو جمع کرکے کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اُن مختلف اطوار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے استقرارِ حمل کے بعد بچہ ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ اُن کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خورد بین ہی سے نظر آسکتی ہیں، بلکہ اُن بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداءً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیق انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انھی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اس سوال کا جواب انسان کے اپنے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو خدا انسان کو اس طرح پیدا کرتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے اس کے لیے آخر اُسے دوبارہ پیدا کرنا کیوں ناممکن ہو؟

| | |
|---|---|
| وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ | اور یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے |
| ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۥ بَلْ | ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" |
| هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ | اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ |
| قُلْ یَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ | ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے |
| الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ | تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے |
| تُرْجَعُوْنَ - (السجدہ - ۱۰-۱۱) | رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔ |

پہلے فقرے اور آخری فقرے کے درمیان پوری ایک داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اِتنا مہمل تھا کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ اُن کا اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم مٹی میں رَل مِل گئے ہوں گے" آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ "ہم" جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رَلتی مِلتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے "ہم" نکل چکا ہوتا ہے۔ اُس جسم کا نام "ہم" نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضا کاٹے جاتے ہیں تو عضو پر عضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر "ہم" پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اُس کا کوئی جُز بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ "ہم" کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پھر پورا جسم موجود ہوتے

ہوئے بھی اُس پر اِس "ہم" کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اِسی لیے تو ایک عاشقِ جان نثار اپنے معشوق کے مُردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اُس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور عاشق اپنے معشوق کو نہیں بلکہ اُس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مقدمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اُس کا دوسرا جزو کہ "کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اِس "ہم" اور اِس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحہ کے لیے بھی کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اِس "ہم" کی موجودہ پیدائش اِس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلہ اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزا جمع ہوئے اور اِس کالبدِ خاکی میں یہ "ہم" براجمان ہو گیا۔ پھر اِس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اِس کالبدِ خاکی میں سے جب "ہم" نکل جاتا ہے تو اُس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزا زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے وہ سب اُسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اِس "ہم" کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اُسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اُسے ازسرِنو اُس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور ممکن کیا معنی، واقعہ کی صورت میں رُونما ہو بھی چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو اِس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعد الموت اور آخرت پر اِس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اِسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ "دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی انوکھی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز اِنھیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بلُوہ (SCOT FREE) یہاں سے نکل جائیں، پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو، پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تمھارا "ہم" جس مکان میں رہتا ہے وہ تو ضرور مٹی میں رَل مِل جائے گا، مگر خود یہ "ہم" مٹی میں نہ ملے گا بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ

پورا کا پورا حراست (CUSTODY) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے:۔

۱- اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آ جاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آکر روح کو ٹھیک اسی طرح باقاعدہ وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری قُرق امین (OFFICIAL RECIEVER) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسرِ موت کے تحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اس عملے کا برتاؤ مجرم روح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومنِ صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ نساء آیت ۹۷، الانعام، ۹۳ — النحل، ۲۸ — الواقعہ ۸۳ — ۹۴)۔

۲- اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا" اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

۳- اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (BIOLOGICAL LIFE) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ انا (EGO) ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ انا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری، جوں کی توں (INTACT) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اسی سے حساب لیا جائے گا اور اسی کو جزا و سزا دیکھنی ہو گی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا — پھر ذرا ان سے پوچھو، ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے

اَمۡ مَّنۡ خَلَقۡنَا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ ۔ (الصّٰفّٰت - ۱۱)

یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں ؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے ۔

یہ کفارِ مکہ کے اس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے ۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے ۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے ۔ پھر فرمایا جاتا ہے کہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے ۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اُسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے ۔ اس کا سارا مادۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں ۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوئی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے ۔ پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اسی کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اِسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہو گی؟

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۔ (المومن - ۵۷)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا کام ہے ۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔

یہ کفّار کے اِس خیال کا جواب ہے کہ انسان کا مر کر دوبارہ جی اُٹھنا غیر ممکن ہے ۔ اِس پر ارشاد فرمایا

جا رہا ہے کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو اُن کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اُس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہو سکتا۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا۔

کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی جس کو اللہ نے بنایا ہے؟

(النّٰزعٰت: ۲۷)

تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جس میں بے شمار تارے اور سیارے، بے حد و حساب شمسی نظام اور اَن گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امرِ محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اِس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اِسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے؟

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۱۵ تا ۲۰)

اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو ہاں، اور تم خدا کے مقابلے میں بے بس ہو۔ بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو عالم طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مرے

اُٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا اُن کے قول کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اِس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور تم اپنے خدا کے آگے بے بس ہو۔ وہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اُس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آ گئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اِس کام کا وقت جب آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوئے پڑے تھے۔ یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ | (یہ لوگ آخرت کو نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں |
| خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ | دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے |
| رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ | اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے |
| نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ | گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے |
| سُطِحَتْ ۝ (الغاشیہ۔ ۱۷ تا ۲۰) | بچھائی گئی؟ |

یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالی کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی ان کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آ سکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دُنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے اُن کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ اُن کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ وہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں ان کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ صادر کر دے کہ ان کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آ گیا؟

بالکل ٹھیک ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش برساتے ہیں، جس کا سورج دن کی روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق، صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ اِن میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۔
ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۔
فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
وَالْأُنثَىٰ ۔ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ
عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۔

کیا انسان ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں)
ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس
کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے۔ پھر اس سے
مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر
نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کرے؟

(القیٰمۃ ۔ ۴۰)

یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی دلیل ہے۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے تو فی الحقیقت اس دلیل کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتیں، اُن کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اگر ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اس بات کی کیا توجیہ ہے کہ آغازِ آفرینش

سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اِس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اُٹھ کر بے تکلف ایک روز یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝

پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

(الطارق ۵ تا ۸)

یعنی انسان ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہونے والے اربوں جرثوموں میں سے کسی ایک جرثومے اور ماں کے اندر سے مہینوں اور برسوں تک نکلنے رہنے والے بیضوں میں سے کسی ایک بیضے کا انتخاب کر کے ایک وقت دونوں کو جوڑ دیتا ہے اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ نشوونما دے کر اُسے اِس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو؟ پھر کون ہے جو رحمِ مادر ہی میں اُس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا تناسب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے، حادثات سے بچاتا ہے، طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے اتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اسے شعور تک نہیں ہوتا کجا کہ وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟ اگر کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اس بات

کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان اِس وقت دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اِس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کر سکتا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثہ کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثہ کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہوگیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثہ کے طور پر ہزاروں لاکھوں برس تک ایک تسلسل کے ساتھ ہو سکتا ہو تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟

| | |
|---|---|
| بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ | بلکہ اِن لوگوں کو تعجب اِس بات پر ہوا کہ ایک خبردار |
| مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا | کرنے والا خود اِنہی میں سے اِن کے پاس آ گیا پھر منکرین |
| شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا | کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے |
| وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ | اور خاک ہو جائیں گے، تو دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟ |
| بَعِیْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ | یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔" (حالانکہ) زمین ان کے جسم |
| الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا | میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور |
| كِتٰبٌ حَفِیْظٌ (قٓ ۲ تا ۴) | ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔ |

اُن لوگوں کو پہلا تعجب تو اِس بات پر تھا کہ اُنہی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اُٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اِس کے بعد مزید تعجب انہیں اِس پر ہوا کہ وہ شخص انہیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے، اور ان سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی

جائے گی۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات اگر ان لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ ان کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے اجزائے جسم جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئندہ بکھرتے چلے جائیں گے اُن کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جُز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہ راست اس کو جانتا ہے اور مزید برآں اس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہوگا اُسی وقت آناً فاناً اس کے فرشتے اس ریکارڈ سے رجوع کر کے ایک ایک ذرّے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر اُنھوں نے دُنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی اس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہوگا جو اس دُنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنی تھا کہ زمین تمہارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرّہ ذرّہ کا ریکارڈ موجود ہے۔

| | |
|---|---|
| اَفَعَیِینَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۔ بَلْ | تو کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک |
| هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ | نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ |

(قٓ - ۱۵)

یہ آخرت کے حق میں عقلی استدلال ہے۔ جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اس منظّم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اس کے لیے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ہی نے ہمیں اور اس پوری کائنات کو بنایا ہے۔ اب یہ امر واقعہ کہ ہم اس دنیا میں موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا، اور موت کے بعد وہ ہمیں پھر پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے

کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔

**آخرت کے وجوب کے دلائل** | قرآن صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا کہ آخرت کو ممکن ثابت کرے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ آخرت کا برپا ہونا ضروری ہے۔ عقل چاہتی ہے، انصاف چاہتا ہے، اخلاق کے تقاضے چاہتے ہیں کہ آخرت ہو اور اس میں انسان کے تمام اُن اعمال کا محاسبہ کیا جائے جو اُس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک کیے، اور اپنے پیچھے اپنے اُن اعمال کے ایسے اچھے یا بُرے اثرات چھوڑ گیا جو بعد میں مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے رہے۔ یہ محاسبہ نہ ہو، اور اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا نہ ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یہ دنیا انصاف سے خالی ہے، اور انسان کو یہاں عقل و شعور دے کر، اخلاق کے خیر و شر کی تمیز دے کر، اور بے شمار اشیاء اور دوسرے انسانوں پر اختیارات دے کر فضول اور بے معنی ہی پیدا کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دنیا کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، اس میں نہ پورا محاسبہ ممکن ہے، نہ پورا انصاف، اور نہ پوری جزا و سزا۔ اس لیے لازماً ایک دوسرا عالم برپا ہونا چاہیے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیا جائے، تمام کھلے اور چھپے اعمال کا اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا محاسبہ کر کے ایک ایک شخص کی ذمہ داری متعین کی جائے، اور اس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ ابدی ہو تاکہ جو شخص جتنی سزا کا مستحق ہے وہ پوری بھگت سکے اور جتنے انعام و اکرام کا مستحق ہے وہ اسے پورا دیا جا سکے۔

اس مضمون کو قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا تاکہ کفار کے پاس انکارِ آخرت کے لیے کوئی دلیل باقی نہ رہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى۔ (القیٰمۃ ۔ ۳۶)
کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو۔ جدھر چاہے چرتا پھرے۔ کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اسی معنی میں ہم شترِ بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شترِ بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اُسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا: أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ۔

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر آنا نہیں ہے؟"

(المومنون۔ ۱۱۵)

اِن مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم با اختیار، اُس کے افعال میں اخلاقی حُسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہیں اُسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اُٹھائے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اُس نے صرف اپنی جبلّت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سُنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اُسے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ تم اپنی موت کے وقت تک ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا و سزا کے مستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس کو خوہ (SCOT FREE) چھوٹ جانا چاہیے اور اس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اُس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اُسے بھی کسی جھینگے یا پتنگے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا، کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیٰمۃ۔ ۱-۲)

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے روز کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی - میں قسم کھاتا ہوں قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کی کہ وہ ضرور آئے گی۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اُسے بیان نہیں کیا ہے، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اُس پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اس گمانِ بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکّی انسان کو، جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لَوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اِس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی بُرائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اُس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے۔ اُس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے،

اور جس بُرائی کا ارتکاب اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہولے، تو اِس کے برعکس صورت میں، جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اُس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اِس طرح کے نفسِ لوّامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعدِ موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اِس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم ہو کر رہ جائے گا، اور اُس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اِس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعدِ موت کا انکار نہیں کر سکتا۔

اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اِس لامتناہی سلسلے میں بجائے اِس کے کہ اُس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اُس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اِسی صورت میں پورا ہوتا ہے کہ اِس دُنیا میں انسان کی صرف ایک ہی زندگی ہو، اور پھر پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ | ہم نے اِس آسمان اور زمین کو، اور اِس دنیا کو جو |
| وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ | ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو |
| ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ | اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، اور |
| لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ | ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ |

| | |
|---|---|
| اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ | کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں ؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں ؟ |

(ص - ۲۹، ۲۸)

یعنی اس کائنات کو ہم نے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ اس ارشاد سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ اللہ ان یہاں شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے اور نہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اُس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دُنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عَبَث کا ارتکاب کیا ہے۔ مگر کیا فی الحقیقت تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں ؟ کیا یہ تصور تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اُس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے ؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اُس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی محرک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر معاذ اللہ ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بیوقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اُٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فسق و فجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى | منکرین نے بڑے دعوے سے کہا کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو "نہیں، |

وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۔ (التغابن ۷)

میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ لیکن ان نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے، حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

ان کی اس بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ تم ہماری قسم کھا کر کہو کہ تم لوگ ضرور اُٹھائے جاؤ گے اور ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ تم دنیا میں کیا کر کے آئے ہو۔ یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا: "وہ پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو، میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اُسے ظہور میں آنے سے روک دو" (آیت ۵۳)۔ پھر سورۂ سبا میں فرمایا "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ تم پر آکر رہے گی" (آیت ۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اُسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اِس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ آپؐ کی زبان سے عمر بھر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں نکلی ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بُہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اُسے کامل یقین نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپؐ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرما رہے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اَغلب تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالاتر ہے۔ اُس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی استدلال سے وہ اِس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ

آخرت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہوگی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے۔ ایک فلسفی اپنے کسی قول پر بھی قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار، فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

پھر قسم کھا کر صرف یہی نہیں کہا گیا کہ مرنے کے بعد تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ اس وقت ضرور تمھیں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں تم کیا کر کے آئے ہو۔ یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا، اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی آگیا کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اِس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو اور جسے اِس دنیا میں بہت سی چیزوں پر تصرّف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی بُرائیاں خود اپنی ذمہ داری پر کی ہوں، اس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور بُرے کی بُرائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اِس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت، مگر یہاں انسان جیسی بااختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کار فرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے۔ کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک بااختیار مخلوق کا غیر ذمہ دار ہونا صریحاً خلافِ عدل و حکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اِس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر کیسے ممکن ہوا؟ اور اُس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصوّر کہاں سے آگیا؟ بے عقلی سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصوّر برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

پھر یہ فرمانا کہ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے، یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لیے اس دنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور ان کا حساب لے؟

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ۝ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ (الدخان ۴۴: ۳۴ تا ۴۰)

یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں، اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اس بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے۔

کفار کا کہنا یہ تھا کہ پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔ اس لیے کفار "پہلی موت" کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے کہ اس کے بعد دوسری کوئی زندگی اور پھر کوئی دوسری موت ہو۔ بلکہ وہ پہلی موت کو جو اس دنیا میں آتی ہے ایک ہی اور آخری موت سمجھتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔

تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اُٹھا لاؤ تا کہ ہمیں زندگی بعد موت کا یقین آجائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر اُن سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

اُن کے اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تُبّع[1] اور اس سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں سے کچھ بہتر تو نہیں ہیں۔ اُن کو ہم نے اُن کے جرائم ہی کی وجہ سے تو ہلاک کیا تھا۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ تو اس خوش حالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبّع کی قوم، اور اس سے پہلے سبا اور قوم فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر ان سے بچ جائیں گے۔

اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رَل مِل جائے گا اور اس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالقِ حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔

رہا ان کا یہ مطالبہ کہ "اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو" اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے

---

[1] تُبّع حمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ۱۱۵ قبل مسیح میں اُن کو یمن پر اقتدار حاصل ہوا اور ۳۰۰ عیسوی تک یہ وہاں حکمران رہے۔

سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اِس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہر حال اپنے وقت مقرر پر ہی ہو گا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اِس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اِسی دنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

| | |
|---|---|
| اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا | کیا وہ لوگ جنھوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے |
| السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ | یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اُنھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک |
| اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً | عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ اُن کا جینا اور |
| مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا | مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ |
| یَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ | اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس |
| وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ | لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ |
| نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ | لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔ |

(الجاثیہ - ۲۱-۲۲)

یہ آخرت کے برحق ہونے پر اخلاقی استدلال ہے۔ اخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے اور بُرے اپنی بُرائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زشتی کی تمیز ہی بے معنی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ پر چلتے ہیں وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی ان کے عیش کو منغّص کر دینے والا ہے۔ لیکن خداوندِ عالم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومنِ صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اُوپر اخلاق کی پابندیاں لگائے رہا۔ حق والوں کے حق ادا کرتا رہا۔ ناجائز فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا۔ اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے

شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں۔ نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا۔ جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا، سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقہ سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انھیں غلط طریقہ سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہو گی نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔

آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگیٔ نفس اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بُرائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارتے ہیں انھیں تامل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق و انصاف کا کوئی احترام اُن کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی ان کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو بُرائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اس بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض و خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑ بُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم

غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رویہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔

| | |
|---|---|
| اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۝ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ | کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر کیا ان کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہو؟) یہ بات ہے تو لائیں اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔ |
| (القلم - ۶۸: ۳۵ تا ۴۱) | |

مکہ کے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو جو نعمتیں دنیا میں مل رہی ہیں یہ ہمارے مقبولِ خدا ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہاں بھی ہم مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہوگا نہ کہ ہم پر۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرمانبردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجہ ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی۔ مگر اپنے اور ان کے اخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں فرمانبرداروں کے ساتھ تو مجرموں کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔ یہ حکم آخر تم نے کس بنا پر لگایا ہے؟ کیا تمہارے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہو؟ یا خدا سے تمہارا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے؟ اور اگر تمہارے معبودوں میں سے کسی نے یہ کہا ہے تو بلاؤ ان کو اور پوچھو کہ

ان میں سے کس نے خدا سے یہ وعدہ لے لیا ہے۔ غرض تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۔ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر۔ ۸-۹)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟ اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اِس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحویٰ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے، آخر اس کی کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے، اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب اُن سے اِس بے دردانہ ظلم کی باز پرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اس پر شرم آتی تھی۔ نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟

(باقی)